كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آوے گا) بس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کرلیا اور (ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو) کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (و فتنہ) کرتے ہوئے سرزمین میں۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی وادیِ تیہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرتِ خداوندی سے بارہ چشمے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہؔ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے افسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چشمے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد منّ و سلویٰ اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور نافرمانی اور ترکِ احکام کو فتنہ و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہو، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعید از قیاس اور خلافِ عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کردی ہو کہ اجزاءِ زمین سے پانی کو جذب کرے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظیر بھی محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہوجائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف و مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے استسقاء کی دعا فرمائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کردیا، کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چشمے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دعاء ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعاء پر اکتفاء کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہو کہ استسقاء کی اصل پانی کے لئے دعاء کرنا ہے، یہ دعاء کبھی خاص نمازِ استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمازِ استسقاء کے لئے عیدگاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعاء کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعاء پر اکتفاء کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے منقول ہو کہ خطبۂ جمعہ ہی میں آپؐ نے دعاء فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعاء کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیرِ دعاء کے انتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول فرمالیں، ان کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ ہمارے واسطے

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا

اپنے پروردگار سے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اگتا ہے زمین سے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں

وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ ھُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ

اور مسور اور پیاز، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

ھُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، اترو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی ان پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ

اور محتاجی اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ

نہیں مانتے تھے احکامِ خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

ع ۷

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

یہ اس لئے کہ نافرمان تھے، اور حد پر نہ رہتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من وسلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں، ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں (جاکر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور (ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جاکر نقش کی طرح) جم گئی اُن پر ذلت (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود اُن کی طبائع میں اولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے (اور) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہوجاتے تھے احکامِ الٰہیہ کے اور قتل کردیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود اُن کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرہ (اطاعت) سے نِکل نِکل جاتے تھے۔

فائدہ: یہ قصہ بھی وادی تیہ کا ہے، من وسلویٰ سے اُکتا کر ان ترکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخلِ حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جاکر رہنے کا حکم ہوا کہ بوؤ جوتو کھاؤ کماؤ۔

اور منجملہ ذلت ومسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قرب قیامت تک کیلئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لٹیروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور شور دجال یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہوجائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلادی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کروگے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہوگے، جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْۤءَ الْعَذَابِ (۷: ۱۶۷) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیلی حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور بہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن عناد اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

معارف ومسائل

یہودیوں پر ابدی ذلت کا مطلب اور اسرائیل کی موجودہ حکومت سے شبہ اور اس کا جواب

آیات مذکورہ میں یہود کی سزا دنیا میں دائمی ذلت ومسکنت اور دنیا وآخرت میں غضب الٰہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلت ومسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہؓ وتابعینؒ سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ لا يزالون مستذلين من وجدهم استذلهم وضرب عليهم الصغار یعنی وہ کتنے ہی مالدار بھی ہوجائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل وحقیر ہی سمجھے جائیں گے جس کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور اُن پر غلامی کی علامتیں لگادے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان کی ذلت ومسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ھم اھل القبالات یعنی الجزیۃ، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں گے، خود اُن کو کوئی قوت واقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورۂ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ۔ (۳: ۱۱۲)

جمادی گئی اُن پر بے قدری جہاں کہیں پائے جائیں مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نابالغ بچے، عورتیں، یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ ومامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدۂ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدۂ صلح کا یا جزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہوجائے، مگر الفاظ قرآنی میں مِنَ النَّاسِ فرمایا ہے مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدۂ صلح کا کرکے اُن کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ استثناء حبل من اللہ اور حبل من الناس کا اگر بقول کشاف استثناء متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہود ہمیشہ ہر جگہ ذلیل وخوار رہیں گے، بجز اُن دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے عورتیں وغیرہ اس ذلت وخواری سے نِکل جائیں، یا معاہدۂ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت وخواری سے بچالیں، اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدۂ صلح کے ذریعہ ذلت وخواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدۂ صلح کرکے بھی ہوسکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدۂ صلح کا کرکے اُن کے

ہمارے ذلت وخواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریر استثناء متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل وخوار رہیں گے، گو قانونِ الٰہی کی وسعت میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہوجائیں گے، یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت وخواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورۂ آلِ عمران کی آیت سے پوری ہوگئی، اور اسی سے وہ تمام شبہات بھی دور ہوگئے جو آجکل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں، کہ قرآن کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں اُن کی حکومت قائم ہوگئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھاؤنی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یورپین طاقتوں نے اسلامی بلاک کو کمزور کرنے کے لئے اُن کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی اُن کی نظروں میں بھی اُن کے فرماں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے سہارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں ان کی شریعت، اُن کی تہذیب سب سے پہلی ہے اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دورِ تنزل کے باوجود ان کی سلطنتیں، بت پرستوں کی سلطنتیں، لامذہبوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ برطانیہ کے زیرسایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہوجائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے!

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا اِن میں سے اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو اُن کے لئے ہے اُن کا ثواب

عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

ان کے رب کے پاس، اور نہیں اُن پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر عذر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً وہ اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ کا ذکر فرمایا کہ یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابئین ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر اور قیامت پر اور کارگذاری اچھی کرے (موافق قانونِ شریعت کے) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے اُن کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جاکر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

فائدہ:- قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری اطاعت اطاعتِ محمدی یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہوجائے گا مستحقِ نجاتِ اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہوگیا، یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہوجائیں تو ہم سب معاف کردیں گے۔

اور صابئین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی، لیکن اس سے کلامِ پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہوگئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا موردِ عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سنانا تو اصل میں مخالف کو ہے، لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اس کی علت اُن سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفتِ موافقت پر مدار ہے ہماری عنایت کا، سو اگر مخالف بھی اختیار کرے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہوجائے گا، اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کردیا گیا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو کہ پکڑو جو

مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (اس قول و قرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کردیا، (اور اس وقت کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراۃ) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ:- جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر توریت عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لاکر قوم کو وہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو اوّل تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہے تب مانیں گے، (جس کا قصہ اوپر گذر چکا ہے) غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آکر انھوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کردی کہ "اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ فرمادیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہوسکے کرنا جو نہ ہوسکے معاف ہے"، تو کچھ تو جبلی شرارت، کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہوسکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کردو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کرلینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، اُن کے لئے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں، یا اطاعت قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اسکی مہربانی

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

تو ضرور تم تباہ ہوتے

خلاصۂ تفسیر

پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا (تو اس عہد شکنی کا مقتضا تو یہ تھا کہ) ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ ہے کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک مہلت دے رکھی ہے، لیکن کب تک! آخر بعد از مرگ وبالِ اعمال میں مبتلا ہوگے)

فائدہ: حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ دنیا میں مومن کافر سب پر ہے جس کا اثر عافیت اور دنیوی راحت ہے، اور رحمت خاصہ کا ظہور آخرت میں ہوگا جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے۔

بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کرکے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔ اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہی اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثتِ محمدیہ سے کی ہے۔

اس مضمون کی تائید کے لئے گذشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم خوب جان چکے ہو جنھوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت اُن لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنے والوں کے واسطے

خلاصۂ تفسیر

اور تم جانتے ہی ہو اُن لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (حدِ شرع سے) تجاوز کیا تھا دربارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے (متعلق تھا کہ اس روز

مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے اُن کو (اپنے حکم قہری تکوینی سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہوگئے) پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ عبرت (انگیز) بنا دیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے، اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آتے رہے، اور (نیز اس واقعہ کو) موجب نصیحت (بنایا، خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے۔

فائدہ: - یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہفتہ کا دن معظم اور عبادت کے لئے مقرر تھا، اور مچھلی کا شکار بھی اس روز ممنوع تھا یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے اور مچھلی کے شوقین تھے، اُس حکم کو نہ مانا، اور شکار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسخ صورت کا عذاب نازل ہوا، تین دن کے بعد وہ سب مرگئے۔

اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے، فرمانبردار و نافرمان، تو نافرمانوں کے لئے تو یہ واقعہ نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا، اس لئے اس کو نکال فرمایا، اور فرمانبرداروں کو یہ واقعہ فرمانبرداری پر قائم رکھنے والا تھا اس کو مَوْعِظَةً فرمایا۔

معارف ومسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا حیلہ جس سے اصل حکم شرعی باطل ہوجائے حرام ہے اس آیت میں یہودیوں کے جس اعتداء یعنی حدود سے تجاوز کا ذکر کرکے اس کو سببِ عذاب بتلایا گیا ہے، روایات سے ثابت ہے کہ وہ صاف طور پر حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ تھی، بلکہ ایسے حیلے تھے جن سے حکم شرعی کا ابطال لازم آتا تھا، مثلاً ہفتہ کے دن مچھلی کی دُم میں ایک ڈورے کا پھندا لگا کر دریا میں چھوڑ دیا، اور یہ ڈور زمین پر کسی چیز سے باندھ دی، پھر اتوار کے روز اس کو پکڑ کر کھالیا، تو یہ ایک ایسا حیلہ ہے جس میں حکم شرعی کا ابطال بلکہ ایک قسم کا استہزاء ہے، اس لئے ایسا حیلہ کرنے والوں کو بڑا سرکش نافرمان قرار دے کر اُن پر عذاب آیا۔

مگر اس سے اُن فقہی حیلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں مثلاً ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا سود میں داخل ہے، مگر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ جنس کا تبادلہ جنس سے نہ کرو، قیمت کے ذریعہ خرید و فروخت کرو، مثلاً دو سیر خراب کھجوریں دو درہم میں فروخت کردیں، پھر ان دو درہموں میں سے ایک سیر عمدہ کھجور خرید لی، تو یہاں حکم شرعی کی تعمیل مقصود ہے ابطال نہ مقصود ہے نہ واقع ہے، اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کی بعض

ایسی ہی تدبیریں بتلائی ہیں، اُن کو یہودیوں کے حیلوں کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

واقعہ مسخ صورتِ یہود تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہود نے اوّل اوّل تو اس طرح کے حیلے کرکے مچھلیاں پکڑیں، پھر ہوتے ہوتے عام طور پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جماعتیں ہوگئیں، ایک جماعت علماء و صلحاء کی تھی جنھوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یہ باز نہ آئے تو اُن سے برادرانہ تعلقات قطع کرکے بالکل الگ ہوگئے، اور بستی کے دو حصے کرلئے، ایک میں یہ نافرمان لوگ رہ گئے، دوسرے میں علماء و صلحاء رہے، ایک روز اُن کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصہ میں یہ نافرمان لوگ رہتے تھے ادھر بالکل سناٹا ہے تو وہاں جاکر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں مسخ ہوگئے تھے، اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اُن کے جوان بندر بنا دیئے گئے تھے اور بوڑھے خنزیر کی شکل میں منتقل کردیئے گئے تھے، اور مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ دار اور تعلق والے انسانوں کو پہچانتے تھے، اُن کے قریب آکر روتے تھے۔

ممسوخ قوم کی نسل نہیں چلتی اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ صحیح مسلم میں منقول ہے، کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں مسخ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو اُن کی نسل نہیں چلتی، (بلکہ چند روز میں ہلاک ہوکر ختم ہوجاتے ہیں) اور پھر فرمایا کہ بندر اور خنزیر دنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے (اور آج بھی ہیں، مگر مسخ شدہ بندروں اور خنزیروں سے اُن کا کوئی جوڑ نہیں)

اس موقع پر بعض مفسرین نے صحیح بخاری کے حوالہ سے بندروں میں زنا کی سزا میں سنگساری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ نہ بخاری کے صحیح نسخوں میں موجود ہے نہ روایۃً صحیح ہے، قرطبی نے اس جگہ اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرماتا ہے تم کو، ذبح کرو ایک گائے

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

وہ بولے کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے کہا پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں۔

خلاصۂ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو

تو تم ایک بیل ذبح کرو، وہ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق کہاں
جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ، جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں،
(کہ احکام خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں)

فائدہ :- یہ قصہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک خون ہوگیا تھا، جس کی وجہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں یہ لکھی ہے کہ کسی شخص نے مقتول کی کسی لڑکی سے شادی کی درخواست کی تھی، مگر اس نے انکار کردیا، اور اس شخص نے اس کو قتل کردیا، قاتل لاپتہ تھا اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔

اور معالم نے کلبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت تک توریت میں اس کے متعلق کوئی شرعی قانون بھی نازل نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ نزولِ توریت سے قبل کا ہے۔

غرض بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چلے، آپ نے بحکم خداوندی ایک بیل ذبح کرنے کا حکم فرمایا، انھوں نے حسب عادت اور اپنی جبلت کے مطابق اس میں حجتیں نکالنا شروع کیں۔

آیات آئندہ میں اسی کی تفصیل ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کہ وہ گائے کیسی ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک

بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾

گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے،

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کیسا ہے اس کا رنگ، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک

بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

گائے ہے زرد خوب گہری ہے اس کی زردی، خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو، بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے

رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ

اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کس قسم میں ہے وہ کیونکہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم اگر اللہ نے چاہا

اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ

تو ضرور راہ پالیں گے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنے والی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو یا

الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ

پانی دیتی ہو کھیتی کو، بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں، بولے اب لایا تو

ع ۸ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

ٹھیک بات پھر اس کو ذبح کیا وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کرلیں گے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کردیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو، (دونوں عمروں کے اوسط میں سو اب (زیادہ حجت مت کیجیو، بلکہ) کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے، (کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کردیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ (بھی) بیان کردیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو، کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کردیجئے کہ (اوّل بار کے سوال کا جواب ذرا اور واضح) ہم سے بیان کردیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں، کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ (رہ باقی) ہے (کہ وہ معمولی بیل ہوگا یا کوئی اور عجیب غریب جس میں تحقیق قاتل کا خاص اثر ہو) اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جاویں گے، موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب و غریب جانور نہیں ہے یہی معمولی بیل ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہئے کہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی جاوے، اور نہ (کنوئیں میں جوڑا گیا ہو کہ) اس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو، (یہ سنکر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اوصاف) بات فرمائی، (القصہ جانور تلاش کرکے خریدا) پھر اس کو ذبح کردیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

فائدہ :- حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ یہ حجتیں نہ کرتے تو اتنی قیدیں ان کے ذمہ نہ ہوتیں جو بھی بقرہ ذبح کردیا جاتا کافی ہوجاتا۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ

اور جب مار ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم

تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ

چھپاتے تھے، پھر ہم نے کہا مارو اس مُردے پر اس گائے کا ایک ٹکڑا اسی طرح زندہ کریگا اللہ مُردوں کو

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور دکھاتا ہے تم کو اپنی قدرت کے نمونے تاکہ تم غور کرو

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا، پھر (اپنی برأت کے لئے) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم (میں کے مجرم و مشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے (ذبح بقرہ کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو (چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہوگیا) آگے اللہ تعالیٰ بمقابلہ منکرین قیامت کے اس قصہ سے استدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مُردوں کو زندہ کر دیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے باز آؤ)۔

فائدہ: جب اس مردہ کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو وہ زندہ ہوگیا، اس نے قاتل کا نام بتایا اور پھر فوراً ہی مرگیا۔

اس جگہ صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا، کہ یہ مقتول سچ بولے گا، ورنہ صرف مقتول کے بیان سے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

یہاں یہ شبہ کرنا بھی درست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی، یا مقتول کو زندہ کئے بغیر قاتل کا نام بتایا جا سکتا تھا، پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی، تو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے تو ہوتا نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے، اور ہر واقعہ کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطۂ علمی میں آسکتی ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں کہ ہر واقعہ کی مصلحت معلوم کریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے، اس لئے اس کے پیچھے پڑ کر اپنی عمر عزیز ضائع کرنے کے بجائے بہتر طریقہ تسلیم و سکوت کا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ

پھر تمہارے دل سخت ہوگئے اس سب کے بعد سو وہ ہوگئے جیسے پتھر یا ان سے بھی

قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ

سخت، اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہیں نہریں اور ان میں

مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ

ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں

خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اللہ کے ڈر سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔

خلاصۂ تفسیر

(گذشتہ واقعات سے متاثر نہ ہونے پر شکایت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے) ایسے ایسے واقعات کے بعد (چاہئے تھا کہ تم لوگوں کے دل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی عظمت سے پُر ہو جاتے، لیکن) تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھر کی سی ہے، یا (یوں کہئے کہ وہ) سختی میں اُن سے (بھی) زیادہ (ہیں) اور (زیادہ سخت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ) بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں، اور (انہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں، پھر اُن سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے، اور (ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں، (اور تمہارے قلوب میں کسی قسم کا اثر ہی نہیں ہوتا) اور (اس قساوت سے جو اعمالِ بد صادر ہوتے ہیں) حق تعالیٰ تمہارے (ان) اعمال سے بے خبر نہیں ہیں (بہت جلد تم کو سزا تک پہنچا دیں گے)۔

فائدہ: اس جگہ پتھر کے تین اثرات بیان کئے گئے ہیں، اول ان سے زیادہ پانی نکلنا، دوم کم پانی نکلنا، ان دو میں تو کسی کو شبہ نہیں پڑتا، تیسری صورت یعنی خدا کے خوف سے پتھر کا نیچے آگرنا، اس میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو، کیونکہ پتھر کو تو عقل اور حس نہیں ہے، سو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خوف کے لئے عقل کی تو ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات لایعقل میں خوف کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، البتہ حس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جمادات میں اتنی حس بھی نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ حس حیات پر موقوف ہے، اور بہت ممکن ہے کہ ان میں ایسی لطیف حیات ہو جس کا ہم کو ادراک نہ ہوتا ہو جیسا جوہر دماغ کے احساس کا بہت سے عقلاء کو ادراک نہیں ہوتا، وہ محض دلائل سے اس کے قائل ہوتے ہیں، تو دلائل طبیہ سے ظاہر نصِ قرآن کی دلالت اور قوت کسی طرح بھی کم نہیں۔

پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیشہ پتھر گرنے کی علت خوف ہی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے اسباب مختلف ہوں، ان میں سے بعض طبعی ہوں اور ایک سبب خوفِ خدا بھی ہو۔

اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور افادہ مقصود

نہایت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے، یعنی بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہوجاتی ہیں جن سے مخلوقِ خدا فائدہ اٹھاتی ہے، اور ان (یہودیوں) کے دل ایسے بھی نہیں (کہ مخلوقِ خدا کی تکلیف و مصیبت میں پگھل جائیں) اور بعض پتھروں میں ان سے کم تاثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے، تو یہ پتھر بہ نسبت اول کے کم نرم ہوئے، اور ان کے قلوب ان درجہ دوم کے پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

اور بعض پتھروں میں گو اس درجہ کا اثر نہیں، مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے (کہ خوفِ خدا سے نیچے گر آتے ہیں) گو درجے میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین جذبۂ انفعال بھی نہیں۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ

اب کیا تم اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ان میں ایک فرقہ تھا

یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ

کہ سنتا تھا اللہ کا کلام پھر بدل ڈالتے تھے اس کو جان بوجھ کر اور وہ

یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

جانتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر (مسلمان یہودیوں کو مومن بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے اور اس میں کلفت اٹھاتے تھے تو یہود کے حالات و واقعات بتا کر مسلمانوں کی امید کا انقطاع کر کے ان کی کلفت اس آیت کے ذریعہ دفع فرماتے ہیں)

(اے مسلمانو!) کیا (یہ سارے قصے سن کر) اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آویں گے، حالانکہ (ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ان سے ہوچکی ہے کہ) ان میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (لطف یہ کہ یہ بھی) جانتے تھے (کہ ہم بُرا کر رہے ہیں، محض اغراضِ نفسانیہ اس کارروائی کا باعث ہوتیں)

فائدہ:۔ مطلب یہ کہ جو لوگ ایسے بیباک اور اغراضِ نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے کہنے سننے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔

اور کلام اللہ سے مراد یا تو توریت ہے، اور سماع سے مراد بواسطۂ انبیاء علیہم السلام کے ہے،

اور تحریف سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفاسیر یا دونوں بدل ڈالنا ہیں، اور یا کلام سے مراد وہ کلام ہے جو ان ستر آدمیوں نے بطورِ تصدیقِ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر سُنا تھا، اور سماع سے مراد بلا واسطہ، اور تحریف سے مراد قوم سے یہ نقل کردینا کہ آخیر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ جو حکم تم سے ادا نہ ہوسکے وہ معاف ہے"

امورِ مذکورہ بالا میں سے کسی امر کا صدور گو ان یہودیوں سے نہ ہوا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ یہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے اُن اعمال پر انکار و نفرت نہ رکھتے تھے، اس لئے حکماً یہ بھی ویسے ہی ہوئے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعۡضُہُمۡ اِلٰی

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دوسرے کے

بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَہُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ

پاس تو کہتے ہیں تم کیوں کہہ دیتے ہو اُن سے جو ظاہر کیا اللہ نے تم پر تاکہ جھٹلائیں تم کو

بِہٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾

اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصۂ تفسیر اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعضے (منافق یہودی) دوسرے بعضے (علانیہ) یہودیوں کے پاس (تو ان سے اُن کی معیت و ہم مشربی کے مدعی ہوتے ہیں اس وقت) وہ (دوسرے یہودی) اُن سے کہتے ہیں کہ تم (یہ) کیا (غضب کرتے ہو کہ) مسلمانوں کو (خوشامد میں) وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو (اُن کے مفید مذہب) اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر منکشف کردی ہیں (مگر ہم مصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں) نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کردیں گے کہ (دیکھو) یہ مضمون اللہ کے پاس (سے تمہاری کتاب میں آیا) ہے کیا تم (اتنی موٹی سی بات) نہیں سمجھتے۔

فائدہ:۔ منافقین کبھی ایک آدھ بات خوشامد میں اپنے ایمان کی سچائی جتلانے کے لئے مسلمانوں سے کہہ دیتے تھے کہ توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہے، یا قرآن مجید کے متعلق خبر آئی ہے، وغیرہ وغیرہ، اس پر دوسرے لوگ اُن کو ملامت کرتے تھے۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۷﴾

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا

اور بعض ان میں بے پڑھے ہیں کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور اُن کے

يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ

پاس کچھ نہیں مگر خیالات، سو خرابی ہے اُن کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہدیتے ہیں

يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ

یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ لیویں اس پر تھوڑا سا مال، سو خرابی ہے اُن کو

لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی اس کمائی سے۔

خلاصۂ تفسیر کیا ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے اُن چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور ان کی بھی جن کا وہ اظہار کرتے ہیں (تو اگر منافقین نے مؤمنین سے اپنا کفر چھپایا تو کیا اور ان ملامت گروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کے مضامین چھپائے تو کیا، اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مضامین سے مسلمانوں کو جابجا مطلع فرمادیا ہے)

اس آیت میں تو یہودیوں کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا، آگے اُن کے ناخواندہ لوگوں کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں کہ:

اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے، لیکن (بلا سند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ کچھ اور نہیں، (ویسے ہی بے بنیاد) خیالات پکا لیتے ہیں (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ تو ان کے علماء کی تعلیم ناقص اور مخلوط ہے، اور پھر اوپر سے اُن میں فہم کی کمی ہے، ایسی صورت میں بجز بے بنیاد خیالات کے حقائقِ واقعیہ کی تحقیق کہاں نصیب ہو سکتی ہے، بقول شخصے "کریلا اور نیم چڑھا" اس میں شکسس کہاں۔

اور چونکہ ان کی اس توہم پرستی میں ان کے علماء کی خیانت بڑا سبب ہے، اس لئے جرم میں بھی وہ اپنے عوام سے زیادہ ہوئے، اسی کا بیان اب یہاں کرتے ہیں۔

(جب عوام مذکورین قابل زجر و توبیخ ہیں اور ان کے جہل کا اصلی سبب اُن کے علماء ہی ہیں) تو بڑی خرابی اُن کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدل سدل کر) کتاب (توریت) کو اپنے ہاتھوں سے (اور) پھر (عوام سے) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کی طرف سے (یوں ہی) آیا ہے (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ نقد قدرے قلیل وصول کرلیں، سو بڑی خرابی (پیش) آوے گی ان کی اس (تحریفِ کتاب) کی بدولت (بھی) جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جس کو وہ وصول کرلیا کرتے تھے۔

فائدہ: عوام کی رضاجوئی کے لئے غلط سلط مسئلے بتلا دینے سے ان کو کچھ نقد وغیرہ بھی وصول ہو جاتا تھا، اور ان کی نظر میں وقعت اور وقار بھی رہتا تھا، اسی غرض سے توریت میں لفظی اور معنوی پھیر پھار بھی کرتے رہتے تھے، اس آیت میں اسی پر وعید سُنائی گئی۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ

اور کہتے ہیں ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے کہہ دو کیا تم لے چکے ہو

عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ أَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اللہ کے یہاں سے قرار کہ اب ہرگز خلاف نہ کریگا اللہ اپنے قرار کے یا جوڑتے ہو اللہ پر

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

جو تم نہیں جانتے

خلاصۂ تفسیر اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتشِ (دوزخ) چھوئے گی (بھی تو) نہیں، (ہاں) مگر (بہت) تھوڑے روز جو (انگلیوں پر) شمار کرلئے جاسکیں (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یوں فرما دیجئے کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ لے لیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے، یا (معاہدہ نہیں لیا، بلکہ ویسے ہی) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

فائدہ: یہود کے اس قول کی مفسرین نے مختلف تقریریں کی ہیں منجملہ اس کے یہ ہے کہ یہ امر محقق ہے کہ مؤمن اگر عاصی ہو تو گو بقدر گناہ دوزخ کے عذاب میں داخل ہو، لیکن ایمان کی وجہ سے دائمی عذابِ جہنم نہ ہوگا، بعد چندے نجات ہو جائے گی۔

پس یہود کے دعوے کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ ان کے بزعم دین موسوی منسوخ نہیں ہے، لہٰذا وہ

مؤمن ہیں، انکارِ نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام و جناب حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کافر نہیں ہوتے، پس اگر کبھی عصیان کے سبب دوزخ میں چلے بھی گئے پھر نکال لئے جائیں گے، اور چونکہ یہ دعویٰ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، کیونکہ دین موسوی کی ابدیت کا دعویٰ خود غلط ہے، لہٰذا انکارِ نبوت میسحیہ و محمدیہ کے سبب وہ لوگ کافر ہوں گے، اور کفار کے لئے بعد چندے دوزخ سے نجات پا جانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے عہد سے تعبیر فرمایا، پس ثابت ہوا کہ دعویٰ بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو ایمان لائے اور عمل کئے نیک

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع ۹ ۹

وہی ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خلاصۂ تفسیر خلوٗ فی النار کا ضابطہ:۔ (بجز چند روز کے تم کو آتشِ دوزخ اکیوں نہیں رلگے گی، بلکہ ابدالآباد تک اس میں رہنا ضرور ہو، کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہو کہ) جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطا (وقصور اس طرح) احاطہ کرلے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور جو لوگ (اللہ و رسول پر) ایمان لاویں اور نیک کام کریں ایسے لوگ اہلِ بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

فائدہ:۔ خطاؤں کے احاطہ کے جو معنی اوپر ذکر کئے گئے ہیں اس قسم کا احاطہ اس معنی کے ساتھ کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی بھی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ کفر کے قبل اگر کچھ نیک اعمال کئے بھی ہوں تو وہ بھی ضائع اور ضبط ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے کفار میں سرتاپا بدی ہی بدی ہوگی جس کی جزا ابدی جہنم ہوگی، بخلاف اہلِ ایمان کے کہ اول تو ان کا ایمان خود بہت بڑا عمل صالح ہے، دوسرے اعمالِ شرعیہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے ہیں، اس لئے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں، پس احاطۂ مذکور ان کی حالت پر صادق نہیں آتا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب اس ضابطہ کی رو سے کافر کا ابدی جہنمی ہونا ثابت ہوگیا، تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء نہیں ہیں، آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ہیں، تو یہود ان کا انکار کر کے کافروں میں شامل ہوگئے، اس لئے اس ضابطہ کی رو سے وہ بھی خالد فی النار ہوں گے، تو ان کا دعویٰ مذکور دلیل قطعی سے باطل ٹھہرا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ

اور جب ہم نے لیا قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ

اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ

کہیو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ پھر

تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٨٣﴾

تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں اور تم ہی ہو پھرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گذاری کرنا، اور اہلِ قرابت کی بھی، اور بے باپ کے بچوں کی بھی، اور غریب محتاجوں کی بھی، اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات (کہنا ہو تو) اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ، پھر تم (قول و قرار کرکے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چندے کے، اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا۔

فائدہ:۔ یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو توریت کے پورے پابند رہے، توریت کے منسوخ ہونے سے قبل شریعت موسویہ کے پابند رہے، جب توریت منسوخ ہوگئی تو شریعتِ محمدیہ کے متبع ہوگئے۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ احکام اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں، جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت، اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی و خوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب داخل ہیں۔

تعلیم تبلیغ میں سخت کلامی کافر سے بھی درست نہیں

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا سے مراد قولاً ذا حسن ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرو تو بات نرم کرو، خوش روئی اور کشادہ دلی کے ساتھ کرو، چاہے مخاطب نیک ہو یا بد، سنی ہو یا بدعتی، ہاں دین کے معاملہ میں مداہنت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (۲۰: ۴۴) تو آج جو کلام کرنے والا ہے وہ حضرت موسیٰؑ سے افضل نہیں، اور مخاطب کتنا ہی برا ہو فرعون سے زیادہ برا خبیث نہیں۔

طلحہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام تفسیر و حدیث عطاءؒ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں، مگر میرے مزاج میں تیزی ہے، میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہدیتا ہوں، حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، اس میں تو یہودی و نصرانی بھی داخل ہیں مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا (قرطبی)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ
اور جب لیا ہم نے وعدہ تمہارا کہ نہ کروگے خون آپس میں اور نہ نکال دوگے
اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾
اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے اقرار کرلیا اور تم مانتے ہو۔

خلاصۂ تفسیر

اور جو عہد میثاق لیا گیا تھا اس آیت میں اس کا تتمہ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول و قرار (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کرکے) باہم خونریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن مت کرانا، پھر (ہمارے اس اقرار لینے پر) تم نے اقرار بھی کرلیا اور اقرار بھی (ضمناً نہیں، بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو۔

فائدہ: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی تقریر سے کسی امر کا اقرار مترشح ہوتا ہے گو صاف اقرار نہیں ہوتا، مگر عرفاً اور عقلاً اس کو اقرار ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں تو ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ نے اس شبہ کو بھی رفع کردیا، اور بتادیا کہ یہ اقرار اتنا صریح اور واضح تھا جیسے شہادت صاف اور واضح ہوا کرتی ہے۔

ترکِ وطن کرانے کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار پہنچا کر اتنا تنگ مت کرنا کہ بیچارہ ترکِ وطن پر مجبور ہوجائے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ
پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ
مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ
کو ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہو اُن پر گناہ اور ظلم سے اور اگر
يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ
وہی آویں تمہارے پاس کسی کے قیدی ہو کر تو ان کا بدلہ دیکر چھڑاتے ہو، حالانکہ حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ
بھی تو کیا مانتے ہو بعض کتاب کو اور نہیں مانتے بعض کو، سو کوئی سزا نہیں اس کی
يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
جو تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن
يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾
پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے

خلاصۂ تفسیر

تتمہ میثاق میں جو حکم ان کو دیا گیا ہے اس کے متعلق عہد شکنی کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے۔

پھر (اس اقرار صریح کے بعد) تم (جیسے ہو) یہ (آنکھوں کے سامنے) موجود (ہی) ہو کہ باہم قتل و قتال بھی کرتے ہو اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن بھی کراتے ہو، (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ (سو ان دونوں حکموں کو تو یوں غارت کیا) اور (ایک تیسرا حکم جو سہل سا سمجھا اس پر عمل کرنے کو خوب تیار رہتے ہو کہ) اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کر رہا کرا دیتے ہو حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو ان کا ترکِ وطن کرا دینا (اور قتل تو اور بھی بدرجہ اولیٰ) ممنوع ہے۔

معارف و مسائل

فائدہ: اس باب میں ان پر تین حکم لازم تھے، اوّل قتل نہ کرنا، دوم اخراج یعنی ترکِ وطن نہ کرانا، سوم اپنی قوم میں سے کسی کو قید و بند میں گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا، تو ان لوگوں نے اوّل کے دو حکم کو تو چھوڑ دیا اور تیسرے حکم کا اہتمام کرنے لگے، اور صورت اس کی یہ ہوئی تھی کہ اہلِ مدینہ میں دو قومیں تھیں: اوس و خزرج، اور ان میں باہم عداوت رہتی تھی، اور کبھی کبھی قتال کی نوبت بھی آجاتی تھی، اور مدینہ کے گرد و نواح میں یہودیوں کی دو قومیں بنی قریظہ اور بنی نضیر آباد تھیں، اوس و بنی قریظہ کی باہم دوستی تھی، اور خزرج و بنی نضیر میں باہم یارانہ تھا، جب اوس و خزرج میں باہم لڑائی ہوتی تو دوستی کی بناء پر بنو قریظہ تو اوس کے مددگار ہوتے، اور بنو نضیر خزرج کی طرفداری کرتے، تو جہاں اوس و خزرج مارے جاتے اور خانماں آوارہ ہوتے ان کے دوستوں اور حامیوں کو بھی یہ مصیبت پیش آتی، اور ظاہر ہے کہ بنو قریظہ کے قتل و اخراج میں بنو نضیر کا بھی ہاتھ ہوتا، اور ایسا ہی بالعکس، البتہ یہود کی دونوں جماعتوں میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال پر راضی کر کے اس قیدی کو رہائی دلا دیتے، اور کوئی پوچھتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو اس کو جواب دیتے کہ اسیر کو رہا کرا دینا ہم پر واجب ہے اور اگر کوئی قتل و قتال میں معین و مددگار بننے پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ کیا کریں دوستوں کا ساتھ نہ دینے سے عار آتی ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے، اور ان کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک فرمایا ہے۔

اس آیت میں جن مخالف قوموں کی امداد کا ذکر ہے اس سے اوس و خزرج مراد ہیں، کہ اوس بنی قریظہ کی موافقت میں بنی نضیر کے مخالف تھے، اور خزرج بنی نضیر کی موافقت میں بنی قریظہ کے مخالف تھے۔

اثم و عدوان (ظلم و گناہ) دو لفظ لانے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس میں دو حق ضائع ہوتے ہیں حکم الٰہی کی تعمیل نہ کر کے حق اللہ ضائع کیا، اور دوسرے کو آزار پہنچا کر حق العباد بھی ضائع کر دیا۔

آگے اس عہد شکنی پر ملامت و شکایت کے ساتھ ساتھ سزا کو بھی بالتصریح بیان فرمایا ہے ارشاد ہے۔

کیا تو (بس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض (احکام) پر ایمان نہیں رکھتے تو اور کیا سزا ہونا چاہئے ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں اور روزِ قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں گے

اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمہارے اعمال (زشت) سے۔

فائدہ: ہر چند کہ وہ یہودی جن کا قصہ میں ذکر ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کی بناء پر کافر ہی تھے، مگر یہاں ان کا کفر مذکور نہیں، بلکہ بعض احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ جب تک حرام کو حرام سمجھے آدمی کافر نہیں ہوتا، سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدت کے پیشِ نظر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، ہم اپنے محاوراتِ عرفیہ میں اس کی مثالیں دن رات دیکھتے ہیں، جیسے کسی ذلیل حرکت کرنے والے کو کہہ دیتے ہیں کہ تُو تو بالکل چمار ہے، حالانکہ مخاطب چمار یقیناً نہیں ہے، اس سے مقصود شدتِ نفرت اور اُس کام کی قباحت ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور یہی معنی ہیں اس حدیث مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ وغیرہ کے۔

اس مقام پر جن دو سزاؤں کا ذکر ہے ان میں سے پہلی سزا یعنی دنیا میں ذلت و رسوائی تو اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب بنی قریظہ قتل و قید کئے گئے اور بنی نضیر ملکِ شام کی طرف بہزار ذلت و خواری نکال دیئے گئے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا

یہ وہی ہیں جنھوں نے مول لی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے سو نہ ہلکا

ع ۱۰ يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿۸۶﴾

ہوگا اُن پر عذاب اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی۔

خلاصۂ تفسیر

(اور وجہ سزا اُن کے لئے یہ ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے (احکام کی مخالفت کر کے) دنیاوی زندگانی (کے مزوں) کو لے لیا ہے، بعوض (نجات) آخرت کے (جس کا ذریعہ اطاعت ہے) سو نہ تو (سزا دینے والے کی طرف سے) ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف کی جاوے گی اور نہ کوئی (وکیل مختار یا دوست رشتہ دار) اُن کی طرفداری (و پیروی) کرنے پاوے گا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ

اور بے شک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح پاک سے

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ

پھر بھلا کیا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول وہ حکم جو نہ بھایا تمہارے جی کو تو تم تکبر کرنے لگے،

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا

خلاصۂ تفسیر اور ہم نے (اے بنی اسرائیل تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے بڑے سامان کئے) سب سے اول) موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توراۃ) دی اور (پھر) ان کے بعد (درمیان میں) پیچھے بعد دیگرے (برابر مختلف) پیغمبروں کو بھیجتے رہے، اور (پھر اس خاندان کے سلسلہ کے اخیر میں) ہم نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل (انجیل اور معجزات) عطا فرمائے اور ہم نے ان کو روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) سے (جو) تائید دی (سو الگ جو بجائے خود ایک دلیل واضح تھی تو) کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا، (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا، سو (ان پیغمبروں میں سے) بعضوں کو تو (نعوذ باللہ) تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بیدھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

فائدہ: قرآن وحدیث میں جابجا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے جیسے قرآن کی اس آیت میں، نیز قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ (۱۶ : ۱۰۲) میں اور حدیث میں حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر ہے

وجبریل رسول اللّٰہ فینا و روح القدس لیس لہ کفاء

اور جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے عیسیٰ علیہ السلام کی کئی طریقوں سے تائید ہوئی، اوّل، تو ولادت کے وقت مس شیطان سے حفاظت کی گئی، پھر ان کے دم کرنے سے حمل عیسوی قرار پایا، پھر یہود چونکہ کثرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے، اس لئے جبرئیل علیہ السلام حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے، حتی کہ آخر میں اُن کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھوا لئے گئے، یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی، اور حضرت زکریا وحضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل بھی کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا

اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو بہت

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

کم ایمان لاتے ہیں

خلاصۂ تفسیر اور وہ (یہودی طنزیہ طور پر) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ اس میں مخالف مذہب کا جو اسلام ہے اثر ہی نہیں ہوتا، تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ پختگی اور محفوظی نہیں ہے) بلکہ اُن کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے (کہ اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفور اور منسوخ مذہب پر مصر ہیں) سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں (اور تھوڑا ایمان مقبول نہیں، پس وہ کافر ہی ٹھہرے)

فائدہ: یہ تھوڑا سا ایمان ان امور کی بابت ہے جو اُن کے مذہب اور اسلام میں مشترک ہیں مثلاً خدا کا قائل ہونا، قیامت کا قائل ہونا کہ ان امور کے وہ بھی قائل تھے، لیکن خود نبوتِ محمدیہ اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے منکر تھے، اس لئے پورا ایمان نہ تھا۔

اور اس تھوڑے ایمان کو باعتبار لغت ایمان کہا، جس کے معنی مطلق یقین کے ہیں، گو وہ بعض اشیاء کے ساتھ ہی متعلق ہو، شرعاً اس کو ایمان نہیں کہتے، شرعاً وہ ایمان معتبر ہے، جو کل امور وارد فی الشرع کے یقین کے ساتھ ہو۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ

اور جب پہونچی اُن کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو اُن کے پاس ہے

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ

اور پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر پھر جب پہنچا ان کو جس

مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ز فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہو گئے، سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر

خلاصۂ تفسیر اور جب اُن کو (ایک) ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو منجانب اللہ ہے، (اور) اس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے، جو (پہلے سے) ان کے

پاس ہو (یعنی توراۃ) حالانکہ اس کے قبل (خود) بیان کرتے تھے (اور) کفار سے (یعنی مشرکین عرب سے کہ
ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں مگر) پھر جب وہ چیز آپہنچی جس کو وہ (خوب
جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر (کہ جان بوجھ کر
محض تعصب کے سبب انکار کریں)

فائدہ:۔ قرآن کو جو مصدق توراۃ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں بعثتِ محمدیہ
اور نزولِ قرآن کی جو پیشگوئیاں تھیں ان سے ان کا صدق ظاہر ہوگیا، سو توراۃ کا ماننے والا تو قرآن
اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر ہی نہیں سکتا ورنہ توراۃ کی تکذیب لازم آئے گی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ حق کو حق جانتے تھے تو پھر ان کو مومن کہنا چاہئے
کافر کیسے کہا گیا!

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں، بلکہ ماننے کا نام ہے، ورنہ یوں تو
شیطان سب سے زیادہ حق کو حق جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اور بھی کفر میں
شدت بڑھ گئی، اسی لئے اگلی آیت میں اُن کے کفر کی وجہ اُن کا عناد بتلایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

بُری چیز ہو وہ جس کے بدلے بیچا انھوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اتاری اللہ

بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ

نے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، سو کما لائے

بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

غصہ پر غصہ اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا۔

خلاصۂ تفسیر | وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اختیار کر کے (وہ بزعم خود) اپنی جانوں کو
(عقوبتِ آخرت سے) چھڑانا چاہتے ہیں، (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ کفر
(انکار) کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے (ایک سچے پیغمبر پر) نازل فرمائی (یعنی قرآن اور
وہ انکار بھی) محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو (یعنی محمد
صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں) نازل فرمائے سو (اس حسد بالائے کفر سے) وہ لوگ غضب بالائے غضب
کے مستحق ہوگئے، اور (آخرت میں) ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہوگی جس میں (تکلیف کے علاوہ) ذلت (بھی) ہو

فائدہ:۔ ایک غضب کفر پر دوسرا حسد پر، یوں غضب بالائے غضب فرمایا، عذاب کے ساتھ
مہین کی قید سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ گناہگار مومن کو عذاب
اس کو پاک کرنے کے لئے ہوگا، ذلت کے لئے نہیں۔

آگے کی آیت میں جو اُن کا قول نقل کیا ہے اس سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، اور حسد بھی
مترشح ہوتا ہے،

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ

اور جب کہا جاتا ہے ان سے مانو اس کو جو اللہ نے بھیجا ہے تو کہتے ہیں ہم مانتے ہیں جو اترا ہے

عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ

ہم پر اور نہیں مانتے اس کو جو سوا اس کے ہے حالانکہ وہ کتاب بھی ہے جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

ان کے پاس ہے، کہہ دو پھر کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر | اور جب ان (یہودیوں) سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ اُن تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ
نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں (اور ان تمام کتابوں میں قرآن
بھی ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس (ہی) کتاب پر ایمان لاویں گے جو ہم (لوگوں)
پر (بواسطہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) نازل کی گئی ہے (یعنی توراۃ) اور (باقی) جتنی (کتابیں)
اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور قرآن) ان (سب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (توراۃ کے
ماسوا کتابیں) بھی (فی نفسہٖ) حق (اور واقعی) ہیں، اور (فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ) تصدیق کرنے والی
بھی ہیں اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی)، آپ (یہ بھی) کہئے کہ (اچھا تو) پھر کیوں قتل
کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھنے والے تھے۔

فائدہ:۔ یہود نے جو یہ کہا کہ "ہم صرف توراۃ پر ایمان لاویں گے دوسری کتب پر ایمان
نہ لاویں گے" تو ان کا یہ قول صریح کفر ہے، اور اس کے ساتھ جو یہ کہا کہ (توراۃ) "جو ہم پر نازل کی گئی ہے"
اس سے حسد مترشح ہوتا ہے، اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ اور کتابیں چونکہ ہم پر نازل نہیں کی گئیں، اس
لئے اُن پر ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس قول کو تین طرح رد فرمایا ہے:

اول یہ کہ جب ان کتابوں کی حقیت اور واقعیت بھی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو پھر اس انکار کی کیا وجہ ہے! ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کرکے تشفی کرلیتے۔ انکار محض کی آخر کیا وجہ!

دوسرے ان کتابیں مثلاً قرآن مجید جو توراۃ کا مصدق ہے تو اس کے انکار سے تو خود توراۃ کی تکذیب وانکار لازم آتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی رُو سے کفر ہے، پھر تمہارے گروہ کے لوگوں نے جو کئی نبیوں کو قتل کیا جن کی تعلیم بھی توراۃ ہی کے احکام کے ساتھ خاص تھی، اور تم ان قاتلین کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہو، تو براہ راست توراۃ کے ساتھ کفر کرتے ہو، اس سے تو تمہارا تورات پر ایمان کا دعویٰ بھی غلط ٹھہرتا ہے، غرض کسی بھی پہلو سے تمہارا قول وفعل صحیح اور درست نہیں۔

آگے بعض اور وجوہ و دلائل سے ان یہودیوں کا رد فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ

اور آچکا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر بنالیا تم نے بچھڑا اس کے

بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

گئے پیچھے، اور تم ظالم ہو۔

خلاصۂ تفسیر اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) بنالیا، موسیٰ (علیہ السلام) کے (طور پر جانے کے) بعد اور تم (اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے۔

فائدہ:۔ بینات سے وہ دلائل مراد ہیں جو اس قصہ سے پہلے جبکہ توراۃ نہ ملی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے نبی برحق ہونے پر قائم ہوچکی تھیں، مثلاً عصا، اور ید بیضاء، دریا کا پھٹنا وغیرہ۔

رد کی تقریر کا حاصل ظاہر ہے کہ تم دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہو اور صریح شرک میں مبتلا ہو جس سے موسیٰ علیہ السلام بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح تکذیب بھی لازم آتی ہے، گوسالہ کو معبود بنانے کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزول قرآن کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرفدار رہتے تھے،

اس لئے فی الجملہ یہ بھی رد میں شامل ہیں۔

اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرکے کفر کیا وہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کے مرتکب ہوں تو چنداں عجیب نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ

اور جب ہم نے لیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہِ طور کو پکڑو جو ہم نے

اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا

تم کو دیا زور سے اور سنو بولے سُنا ہم نے اور نہ مانا اور پلائی گئی ان کے

فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ

دلوں میں محبت اسی بچھڑے کی بسبب ان کے کفر کے کہہ دے کہ بری باتیں سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اگر تم ایمان والے ہو۔

خلاصۂ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تمہارا قول وقرار لیا تھا، اور (اس قول وقرار لینے کے لئے) طور کو تمہارے (سروں کے) اوپر لا کھڑا کیا تھا اور اس وقت حکم دیا تھا کہ (جو کچھ (احکام) ہم تم کو دیتے ہیں ہمت (اور پختگی) کے ساتھ لیا اور (ان احکام کو دل سے) سنو (اس وقت) انھوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کرلیا اور) سن لیا، اور (چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی، اس لئے گویا بزبان حال یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا، اور (وجہ ان کی اس بددلی کی یہ تھی کہ) ان کے قلوب (کے رگ وریشہ) میں وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا، ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے (جبکہ دریائے شور سے اُتر کر انھوں نے ایک بُت پرست قوم کو دیکھ کر درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے کوئی ایسا ہی مجسم معبود تجویز کردیا جائے) آپ فرما دیجئے کہ (دیکھ لیا تم نے اپنے ایمان مزعوم کے افعال کو سو) یہ افعال تو بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے، اگر تم (بزعم خود اب بھی) اہلِ ایمان ہو (یعنی یہ ایمان نہیں ہے)۔

فائدہ:۔ اس آیت میں جو اسباب اور سببات مذکور ہیں، اُن کی ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ دریائے شور سے پار ہو کر ان سے ایک کلمۂ کفر کا صدور ہوا، ہرچند موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ ڈپٹ

سے توبہ کرلی، لیکن توبہ کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی توبہ نہ ہونے کے سبب اس کی ظلمت قلب میں کچھ باقی رہ گئی تھی، وہ ترقی پاکر گوسالہ پرستی کا سبب بن گئی، پھر اس کی توبہ میں بعضوں کو قتل ہونا پڑا، اور بعض کو غالباً بلا قتل معافی ہوگئی ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر بھی کیا ہے، اُن کی توبہ بھی کچھ ضعیف ہوئی ہوگی، اور جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے تھے ان کو بھی گوسالہ پرستوں سے جس قدر نفرت واجب تھی اس میں کوتاہی ہونے سے ایک گونہ اثر اس معصیت شرکیہ کا ان کے قلب میں باقی تھا، بہرحال ضعف توبہ یا کفر سے نفرت نہ ہونے کے آثار باقی رہنے نے دلوں میں دین سے سستی پیدا کردی، جس سے اخذ میثاق میں کوہِ طور کو ان پر معلق کرنے کی نوبت آئی۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

کہہ دے کہ اگر ہے تمہارے واسطے آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تنہا سوا اور لوگوں

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ

کے تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچ کہتے ہو ، اور ہرگز

يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

آرزو نہ کریں گے موت کی کبھی بسبب اُن گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت کی نعمتیں خالص ہمارا ہی حق ہیں اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کو باطل کرنے کے لئے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالمِ آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہی بلا شرکت غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کرکے دکھلا دو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، اور (ہم ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتے ہیں کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے، بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی فردِ قرارداد جرم سنا کر سزا کا حکم کر دیا جائیگا)

فائدہ: قرآن کی بعض اور آیات سے بھی اُن کے اس دعویٰ کا مفہوم نکلتا ہے جیسا کہ:
قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (۲ : ۸۰) وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (۲ : ۱۱۱)، وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ (۵ : ۱۸) وغیرہا۔

ان سب دعووں کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دینِ حق پر ہیں، لہٰذا آخرت میں ہم کو تو ضرور

نجات ملے گی، ہم میں سے جو تائب یا مرحوم ہیں اُن کو تو ابتداء ہی جنت میں داخلہ مل جائے گا، اور جو گنہگار ہیں وہ چند روزہ عذاب بھگت کر نجات پاجائیں گے، اور جو مطیع ہیں وہ بمثل ابناء و احباء محبوب و مقرب ہیں۔

بعض عنوانات کے قبح سے قطع نظر یہ دعوے دینِ حق پر قائم ہونے کی صورت میں فی نفسہٖ تو درست و صادق ہیں، لیکن چونکہ وہ لوگ اپنے دین کے منسوخ ہوجانے کی بناء پر حق پر نہ رہے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جابجا مختلف عنوانات اور طریقوں سے ان کی تکذیب فرمائی، یہاں ایک خاص طریقہ ذکر کیا گیا، کہ اگر عام عادت کے مطابق بحث اور دلائل سے فیصلہ نہیں کرتے تو آؤ مافوق العادۃ طریقہ یعنی معجزے کے ذریعے اس میں نہ زیادہ علم و فہم کی ضرورت ہو نہ غائر نظر درکار، صرف زبان ہلانے کی ضرورت ہے، مگر ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تم زبان سے یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم موت کی تمنا کرتے ہیں"۔

اس پیشین گوئی کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعووں میں سچے ہو تو یہ کلمہ کہہ دو، نہ کہا تو پھر تمہارا جھوٹا ہونا ثابت ہوجائے گا۔

چونکہ ان کو اپنا باطل اور کفر پر ہونا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کا حق پر ہونا اُن پر خوب واضح و روشن تھا، اس لئے یا تو ایسی ہیبت چھائی کہ زبان ہی نہ اُٹھی، یا وہ ڈر گئے کہ تم نے یہ کلمہ مُنہ سے نکالا اور موت نے آ دبوچا، اور پھر سیدھے جہنم رسید ہوئے، ورنہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عداوت و دشمنی تھی اس کے پیشِ نظر تو ان کو یہ سن کر جوش آجانا چاہئے تھا، اور یہ کلمات ضرور کہہ دینے چاہئے تھے۔

درحقیقت اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بہت کافی ہے۔

یہاں دو باتیں اور قابلِ ذکر ہیں،

اوّل تو یہ کہ یہ استدلال ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، اور جنھوں نے آپ کو نبی پہچاننے کے بعد عناد و عداوت کی بناء پر آپ کا انکار کیا، ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں۔

دوسرے یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ تمنا کرنا دل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے، ممکن ہے انھوں نے دل سے تمنا کی ہو، اوّل تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اس کی صاف تردید کر رہا ہے، دوسرے اگر وہ دل سے تمنا کرتے تو زبان سے ضرور اس کا اظہار کرتے، کیونکہ اس میں تو اُن کی جیت تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کا اچھا موقعہ تھا۔

اور یہ شبہ بھی نہ کرنا چاہئے کہ انھوں نے تمنا کی ہو، مگر اس کی شہرت نہ ہوئی ہو، یہ اس لئے

صحیح نہیں کہ اسلام کے ہمدرد و معاونین کی تعداد کے مقابلہ میں، معاندین و مخالفین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو وہ خود اس کو خوب خوب اچھالتے، کہ دیکھو تم نے جو معیارِ حق و صداقت مقرر کیا تھا اس پر بھی ہم پورے اُترے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ

اور تو دیکھے گا اُن کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی

يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ

چاہتا ہے ایک ایک اُنہیں کا کہ عمر پاوے ہزار برس اور نہیں اس کو بچانیوالا عذاب سے

ع الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

اس قدر جینا، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر اور (وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے) آپ (تو) ان کو حیات (دنیویہ) کا حریص (اور عام) آدمیوں سے (بھی) بڑھ کر پائیں گے، اور (اور وں کا تو کیا ذکر حیرت تو یہ ہے کہ بعض) مشرکین سے بھی (بڑھ کر آپ ان کو حیات کا حریص دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت ہے کہ) ان میں کا ایک (ایک) شخص (اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے اور (بھلا بالفرض اگر اتنی عمر ہو بھی گئی تو کیا) یہ امر عذاب سے تو بچا نہیں سکتا، کہ (کسی کی بڑی) عمر ہو جائے اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال (بد جس پر ان کو عذاب ہونے والا ہے)

فائدہ:- اس میں حیرت و استبعاد کی وجہ یہ ہو کہ مشرکین عرب تو آخرت کے منکر تھے، ان کی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر طول عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجیب نہیں، مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعم خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دنیا میں رہنے کی تمنا کریں، یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔

پس باوجود اعتقادِ آخرت کے طولِ عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے، حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا، اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی!

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

تو کہہ دے جو کوئی ہووے دشمن جبرئیل کا، سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ

کہ سچا بتانیوالا ہے اس کلام کو جو اس کے پہلے ہے اور راہ دکھاتا ہے اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو جو

عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

کوئی ہووے دشمن اللہ کا اور اسکے فرشتوں کا اور اسکے پیغمبروں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا تو اللہ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

دشمن ہے ان کافروں کا۔

خلاصۂ تفسیر (بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنکر کہ جبرئیل علیہ السلام وحی لاتے ہیں کہا کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے، ہماری قوم پر واقعات ہائلہ اور احکاماتِ شاقہ انہی کے ذریعے آتے رہے ہیں، میکائیل خوب ہیں کہ بارش اور رحمت ان کے متعلق ہے، اگر وہ وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے، اس پر حق تعالیٰ رد فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یہ کہئے کہ جو شخص جبرئیلؑ سے عداوت رکھے (رہ جانے لیکن اس امر کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل! کیونکہ اس میں تو وہ سفیر محض ہیں) سو (سفارت کے طور پر) انھوں نے یہ قرآن پاک آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے! البتہ خود قرآن کو دیکھو کہ کیسا ہے سو) اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (آسمانی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے (مصالح ضروریہ کی) اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو (اور کتب سماویہ کی یہی شان ہوتی ہے، پس قرآن ہر حال میں کتابِ سماوی اور قابلِ اتباع ٹھہرا، پھر جبرئیل علیہ السلام کی عداوت سے اس کو نہ ماننا نری حماقت ہے، اب رہا خود مسئلہ عداوتِ جبرئیلؑ کا، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا یا اس کے دوسرے ملائکہ سے یا اس کے رسولوں سے، یا خود میکائیلؑ سے، جن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں ان سب سے عداوت رکھنا اور جبرئیلؑ سے عداوت رکھنا یہ سب ہم پلہ شمار کئے جاتے ہیں، اور ان سب عداوتوں کا قانون یہ ہے کہ) جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو (تو) اور فرشتوں کا ہو (تو) اور پیغمبروں کا ہو (تو) اور جبرئیل کا (ہو تو) اور میکائیل کا (ہو) تو (ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾

اور ہم نے اُتاریں تیری طرف آیتیں روشن اور انکار نہ کریں گے اُن کا مگر وہی جو نافرمان ہیں